

زائدہ بشیر

پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، لاہور

ڈاکٹر ریحانہ کوثر

صدر شعبہ اردو، لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، لاہور

اُردو کا لم نگاری میں لاہور کی تہذیب و ثقافت

Abstract:

Raison d'etre of Column writing in Urdu Literature is by no means novel or nascent. This invention in literary conventions is said to have started in this part of the world in the second decade of 20th century when some renowned Urdu scholars like Abul Kalaam Azaad, Maulana Muhammad Ali Johar, Maulana Zafar Ali Khan, Charaagh Hassan Hasrat, Haji Laq Laq and Hameed Nizami became pioneers of this field of Urdu literature. They were regular writers in newspapers of those times, the forerunner being, Jaam e Jehan Numa (started publication on 27th March 1823). This was how the column writing paved its way for entrance in the domain of Urdu literature prior to political Division of Subcontinent. After independence, this art progressed, diversified and improvised its theme, its focus and its peripheral influence on public opinion when many stalwarts of Urdu Journalism and literature like Abdullah Malik, Nasrullah Khan, Intezar Hussain, Ibrahim Jalees, Ibn e Insha, Majeed Lahori, Munnu Bhai, Mustansar Hussain Tarar, Ata ul Haq Qasmi and scores of other played their role in Column writing and portrayed Lahori Culture with all its alpha and omega. The most prominent figure amongst these renowned columnists is Mustansar Hussain Tarar who depicted Lahorite culture not only in his columns but also in every walk of Urdu

literature he strived for. While doing this he hardly missed any aspect of Lahori Culture and as such all credit goes to him. The be all and end all of discussion is that Column writing has been an interesting field of Urdu literature which attracts the reader in keeping abreast of day to day situations, happenings, occurrences and news in a light manner which would otherwise have been very dry, boring and unattractive. By employing this art in literature readers have be enabled to learn about every bit of useful knowledge about culture and civic life of Lahore.

Keywords:

Lahore, Column, Culture, Civilization, Literature, Civic Life, Literary

کالم نگاری کو اگر بادی النظری میں دیکھا جائے تو کالم نگاری نہ تو ادب دکھائی دیتی ہے اور نہ ہی اسے شاعری سے کوئی واسطہ ہے اور نہ ہی اسے محض سیاست نامہ کہا جاسکتا ہے۔ کالم نگاری اگر کچھ ہے تو حرف و حکایت کا ایک سلسلہ ہے جو کالم نگار اس معاشرے میں رہتے ہوئے محسوس کرتا ہے، دیکھتا ہے، سُنتا ہے اور پھر اسے قلم بند کر دیتا ہے۔ اس لحاظ سے کالم نگاری ادب بھی بن جاتی ہے اور صحافت بھی، کیوں کہ کالم نگاری کی بنیاد بھی جذبات و محسوسات ہیں جو لکھنے والا اس معاشرے میں رہتے ہوئے محسوس کرتا ہے اور یہی محسوسات کالم نگار کالم کی صورت اپنے پڑھنے والے تک پہنچاتا ہے۔

کالم، قدیم فرانسیسی زبان کے لفظ Columne سے اور لاطینی زبان کے لفظ Columna سے انگریزی میں آیا۔ جس طرح انگریزی زبان میں ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنی ہیں اگرچہ ان کے حروف وہی رہتے ہیں مگر مطالب کہیں کے کہیں نکل جاتے ہیں۔ اسی طرح کالم Column کے بھی مختلف معنی ہیں۔ مثلاً مختلف رقوم اگر جمع کی غرض سے اوپر نیچے رکھی جائیں تو انھیں Column of Figure کہا جاتا ہے۔ فوج کا دستہ کالم آف سولجرز (Column of Soldiers) کہلاتا ہے۔ وطن کے بچھے ہوئے دشمنوں کے لیے ’ففتھ کالم‘ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں:

جدید اردو لغت میں کالم نگاری کے معنی کچھ اس طرح درج ہیں کہ:

”Column۔ اخبار کے صفحے کا ایک حصہ۔ اخبار یا بوے ساز کی کتاب کے صفحے کو پڑھنے میں

آسانی پیدا کرنے کے لیے حصوں یا کالموں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔“ (۱)

کالم نگاری کے ضمن میں ڈاکٹر انور سدید کی رائے کچھ اس طرح سے ہے کہ:

”کالم نگاری کو فروغ صحافت سے ملا تھا لیکن اخبار کی خبروں اور ادارے کی معلومات اور

تبصرے اور تجزیے کے مقابلے میں کالم میں زندگی کے کسی شعبے کے بارے میں کالم نگار ہلکے

پھلکے، شگفتہ اور لطیف انداز میں اظہار خیال کرتا اور انشائیہ کے انداز میں موضوع کے انوکھے

زاویے اُبھارتا۔“ (۲)

تمام ادبی اصناف کی طرح 'کالم نگاری' کی بھی کوئی ایک تعریف نہیں جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔ لیکن کالم نگاری کو ایک ایسی صنف قرار دیا جاسکتا ہے جس میں کالم نگار زندگی کے کسی بھی شعبے کے بارے میں اپنے جذبات و محسوسات کو ہلکے پھلکے انداز میں پیش کر کے موضوع کا کوئی نیا زاویہ اور نئی سوچ پڑھنے والے کو پیش کرتا ہے۔ اس کے موضوعات اس قدر وسیع ہیں کہ سیاسی و سماجی حوالوں سے لے کر تہذیبی، ثقافتی اور اخلاقی قدروں تک کالم نگاری کے موضوع ہو سکتے ہیں۔ ہم کالم نگاری کی ہمہ گیر وسعت اور معنویت سے انکار نہیں کر سکتے۔ کالم نگاری کا آغاز تو امریکہ میں اٹھارویں صدی کے اواخر میں جریدہ 'ویلیکی میوزیم' میں جوزف ڈینی نے کیا لیکن سر سید احمد خان نے انگریزی زبان کے انشائیہ لکھنے والے سٹیل اور ایڈیسن کو بھی 'سپیکٹیلر' اور 'ٹیلر' میں لکھنے کے باعث تہذیب کے پیغمبر شمار کیا۔ اردو میں کالم نویسی کی واضح صورت بیسویں صدی کے دوسرے عشرے کے اخبارات میں نظر آتی ہے۔ کچھ محققین کالم نگاری کے ابتدائی نقوش اردو کے پہلے اخبار 'جام جہاں نما' (جو ۲۷ مارچ ۱۸۲۳ء میں شروع ہوا) کی خبروں میں تلاش کرتے ہیں اور کچھ لوگ ۱۸۷۷ء میں شروع ہونے والے اردو اخبار 'اودھ پنچ' میں لکھنے والے جوالا پرشاد برق، احمد علی شوق، نواب سید آزاد، اکبر حسین، مجھو بیگ ستم ظریف اور منشی منشی احمد علی کسمندوی کی مزاحیہ تحریروں کو بھی کسی حد تک کالم نگاری کہا گیا۔

ان آراء کے بارے میں جو کچھ بھی کہا جائے کالم نگاری کا آغاز 'جام جہاں نما' سے ہو یا 'اودھ پنچ' سے ہو، بہر حال اردو میں کالم نگاری کا آغاز بیسویں صدی کے دوسرے عشرے سے ہی ہوا۔ اردو صحافت میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہر، مولانا عبدالمجید سالک، حاجی لق لق، حمید نظامی، چراغ حسن حسرت، صالح محمد صدیق، عبدالسلام خورشید اور حیات اللہ انصاری کے نام آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد ظہور الحق ڈار، انعام درانی، نصر اللہ خان، انتظار حسین، ابراہیم جلیس، ابن انشاء، عطا الحق قاسمی، منو بھائی، مجید لاہوری کے علاوہ اور بہت سے نام نظر آتے ہیں۔ جہاں تک ادبی صحافت کا تعلق ہے تو ماہانہ ادبی صحافت میں محمد حسین عسکری، ڈاکٹر جمیل جالبی، ضیا جانندھری اور جیلانی کامران کا حصہ اس روایت میں شامل ہے۔

کالم نگاری کی روایت آزادی سے قبل ہو یا آزادی کے بعد یا پھر موجودہ دور میں ادبی صحافت کا حصہ ہو اس سے جڑے بہت سے نام ادب کے درخشاں ستارے ہیں اور ادبی دنیا میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ادب چونکہ سیاسی اور سماجی شعور رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد میں موجود روایات کو بھی بخوبی نبھاتا ہے اس لیے معاشرتی زندگی کے بدلتے رنگ اور رویے سب سے زیادہ ادیب پر اثر انداز ہوتے ہیں لیکن ادب کی دوسری اصناف (ناول، افسانہ، ڈرامہ) کے برعکس کالم لکھتے ہوئے لکھنے والا تخیل سے زیادہ حقیقت کو مدنظر رکھتا ہے کیوں کہ کالم اکثر و بیشتر حالات حاضرہ اور روزمرہ زندگی کے چھوٹے بڑے واقعات پر روشنی ڈالتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ زندگی میں تہذیبی، معاشرتی اور ثقافتی ادروں کو بھی بیان کرتے ہیں۔ اس لیے کالم نگاری میں اُس عہد کے معاشرے کی تہذیبی اور ثقافتی قدروں کی جھلک بھی نظر آتی ہے اور بعض اوقات یہی تہذیبی اور ثقافتی اقدار ہی کالم کا موضوع قرار پاتی ہیں۔ اگرچہ کالم نگاری کا تعلق صحافت سے ہے لیکن صحافت اور ادب کے باہمی تعلق کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ صحافت زندگی کے ہر شعبے (خواہ اُس کا تعلق معاشرے کے کسی بھی طبقے سے ہو) کی نمائندگی کرتا ہے اور پھر بہت سے کالم نگاروں کا تعلق ادبی دنیا سے بھی ہے۔ اس لیے کالم

نگاری میں ایک ادبی رنگ بھی نظر آتا ہے اور ادبی انداز تحریر کو شائستگی اور تہذیب بھی عطا کرتا ہے۔ اس لیے کالم نگاری چاہے صحافت سے متعلق ہو اسے ادب سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا اور ادب اپنے عہد کا ترجمان ٹھہرتا ہے۔ اُس عہد کی روایات سے جُڑی زندگی، میلے ٹھیلے، کھانا پینا، پہننا اور ڈھنا، رسومات اور دوسرے طور طریقے ادب میں جھلکتے ہیں اور کسی بھی عہد میں تخلیق ہونے والا ادب اُس عہد کی تہذیبی روایات سے الگ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح کالم بھی اپنے وقت کی سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تہذیبی و ثقافتی تبدیلیوں اور روایتوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ کالم نگار وہی اپنے کالم میں پیش کرتا ہے جو وہ اپنی روزمرہ زندگی میں دائیں بائیں دیکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور کے کالم اپنے عہد کی زندگی کے عکاس رہے ہیں۔

لاہور کا شمار برصغیر پاک و ہند کے اُن چند شہروں میں ہوتا ہے جو علمی، ادبی، سیاسی اور صحافتی مراکز کے طور پر اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔ لاہور سے ہر دور میں بہت سے اخبارات، رسائل، ماہنامے، ہفتہ وار شائع ہوتے رہے ہیں اور ان میں بہت سی نامور ادبی شخصیات کالم تحریر کرتی رہی ہیں۔ ان کالموں میں جہاں اور بہت سے حالاتِ حاضرہ کے موضوعات ہوتے ہیں وہاں لاہور کی تہذیبی و ثقافتی زندگی بھی ان میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ لاہور ایک قدیم شہر ہونے کے ساتھ ساتھ صدیوں تک ہندوستان کی تہذیب و ثقافت اور سیاست و سیاحت میں اہم مرکز رہا ہے۔ اس لیے اس کی تاریخ جہاں متنوع ہے وہاں اس کی تہذیب و ثقافت میں بھی رنگارنگی ہے۔ پران نوال اپنی کتاب میں لاہور کے بارے میں لکھتے ہیں:

”برصغیر پاک و ہند میں چند ہی شہر ایسے ہوں گے جن کی تاریخ کو لاہور سے زیادہ متنوع کہا جاسکتا ہے۔ لاہور ایک ایسا شہر ہے جس پر ہندو راجاؤں، مغل شہنشاہوں، سکھ بادشاہوں اور برطانوی مقتدروں نے حکومت کی۔ اپنی آب و تاب اور ظاہری دولت کی وجہ سے اس شہر نے دور و نزدیک کے غیر معمولی افراد کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔۔۔ مغل دارالحکومت کے طور پر اس کے شباب کے دنوں میں ایک کہاوت اکثر سنائی دیتی ہے کہ اصفہان اور شیراز دونوں مل کر بھی آدھے لاہور کے برابر نہیں ہیں۔“ (۳)

اس تاریخی شہر کی تہذیب و ثقافت کے ہمہ گیر پہلوؤں کو یہاں کے ادیب اپنی تخلیقات میں بھرپور انداز سے بیان کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں سے چھپنے والے کالم چاہے کسی روزنامے کا حصہ ہوں یا ماہنامے کا اُن میں لاہور کی تہذیب و ثقافت اپنی جھلک ضرور دکھاتی ہے۔ بعض کالم نگاروں نے تو اپنی محبت اور چاہت کو جو انھیں اس تاریخی شہر سے چھپا س شہر کے نام کو اپنے نام کا حصہ بنا کر امر کر دیا۔ جیسے مجید لاہوری نے اپنے نام کے ساتھ لاہوری کا لاحقہ لگائے رکھا۔ اسی طرح ۱۹۶۲ء میں مشہور صحافی ظفر اقبال مرزا اُن میں لاہوری کے نام سے کالم لکھا کرتے تھے اور اسی قلمی نام سے پورے ملک میں مشہور تھے۔ اسی طرح مشہور افسانہ اور ناول نگار انتظار حسین نے اپنے کالم کا عنوان ہی لاہور نامہ رکھا۔ مستنصر حسین تارڑ نے جہاں لاہور کی تہذیب و ثقافت کو اپنے ناولوں اور سفر ناموں میں بیان کیا ہے وہاں اپنے کالموں میں بھی لاہوری تہذیب و ثقافت کو بھرپور طریقے سے سمویا ہے۔ ان کے علاوہ بھی بے شمار کالم نگار اپنے کالم تحریر کرتے ہوئے لاہور کی تہذیب و ثقافت کے ساتھ اس کی قدامت، سیاست اور تاریخ کو اپنے کالموں کا حصہ بناتے ہیں کیوں کہ اکثر کالم

نگار اسی شہر سے تعلق رکھتے ہیں اور انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسی شہر بے مثال میں گزارا ہے۔ ان کا بچپن، لڑکپن، جوانی اور پھر عمر کے باقی ایام بھی یہیں بسر ہوئے ہیں اس لیے لاہوری بود و باش اُن کے کالموں میں سمٹ گئی ہے۔ مشہور صحافی اور ادیب عبداللہ ملک نے روزنامہ 'امروز' (جواب شائع نہیں ہوتا) میں اگست تا دسمبر ۱۹۵۱ء میں (ع۔م) کے نام سے کالم تحریر کیے۔ ان کالموں میں عبداللہ ملک نے لاہور کی علمی، ادبی، ثقافتی، سیاسی اور سماجی تاریخ و واقعات کو موضوع بنایا ہے۔ ان کالموں میں اُس دور کی تہذیب اور ثقافت کے ساتھ لاہور کی بھرپور سماجی زندگی پڑھنے والے کے سامنے آکھڑی ہوتی ہے۔ ۱۴ اگست کو جشنِ آزادی کے حوالے سے لکھا گیا کالم اُس دور میں لوگوں کے جوش و خروش کو اس طرح بیان کرتا ہے:

”لاہور میں یومِ آزادی کے جشن منانے کی تیاریوں نے ایک عجیب و غریب کیفیت پیدا کر دی ہے۔ سڑکوں، بازاروں، کوچوں کو پاکستانی پرچموں سے سجایا جا رہا ہے۔ جگہ جگہ موم بتیاں، چراغوں اور گیسوں کا انتظام ہو رہا ہے۔ یتیم خانوں اور پانچ گھروں میں مٹھانیوں کی تقسیم کا انتظام ہو رہا ہے۔ ہوٹلوں اور ریسٹورانوں میں Cabre اور موسیقی کے نئے پروگرام مرتب ہو رہے ہیں۔ یومِ آزادی نے لاہور کے شہریوں میں ایک نئے عزم اور ایک نئے اعتقاد کو جنم دیا ہے۔ آج وہ آزادی کے جشن کی تیاریوں میں مصروف ہیں..... ان میں اپنے وطن عزیز کی حفاظت کے جذبے نے ایک نئے دلولے اور جوانی کو جنم دیا ہے۔“ (۴)

کالم میں چونکہ تخیل کی کارفرمائی بہت کم ہوتی ہے اور حقیقت زیادہ، اس لیے کالم میں پیش کردہ زندگی اور اس سے متعلق حقیقتیں بہت سادہ اور زندگی سے قریب تر ہوتی ہیں۔ کالم نگار اپنے گرد و پیش میں جو کچھ دیکھتا ہے اُسے اپنے کالم کا حصہ بنا کر تہذیب و ثقافت کی سچی تصویریں قاری کے سامنے لاتا ہے اور یوں یہ کالم کسی شہر کے کسی بھی عہد کی زندگی کے ترجمان ٹھہرتے ہیں۔ دانش ور اور ادیب چونکہ معاشرے کے وہ افراد ہوتے ہیں جن کی سوچ عام لوگوں پر اثر انداز ہوتی ہے اور وہ اپنی سوچ کے ذریعے اپنے ماحول اور اُس سے مجوسی زندگی کے تمام طبقات کے مسائل، تجربات اور احساسات بہ زبانِ قلم اپنے پڑھنے والوں تک پہنچاتے ہیں۔ اس سلسلے میں اخبار عوام تک پہنچنے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے کیوں کہ اخبار روزانہ ایک عام آدمی تک پہنچتا ہے۔ وہ خود نہ بھی خریدے کسی دکان پر، کسی بس یا ٹرین یا پھر کسی بھی عوامی جگہ پر اخبار کا لکھا ضرور ایک عام آدمی تک رسائی پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک کتاب کی نسبت ایک کالم زیادہ مؤثر ابلاغ رکھتا ہے اور کالم چونکہ عام زندگی سے زیادہ قریب ہے اس لیے زندگی جیسی ہے، جہاں ہے کی سچی تصویر پیش کرتا ہے اور کالموں میں پیش کردہ حالات و واقعات زندگی کے سچے مظہر ہوتے ہیں۔ شہر میں ہونے والے سیاسی، غیر سیاسی واقعات، لوگوں کا رہن سہن، کھانا پینا، خوشی غمی، ملنا جلنا، میلے ٹھیلے، تہوار غرض شہر کی تقریبات تک کالموں میں بیان ہوتی ہیں۔ لاہوری زندگی میں انگریز کے آنے سے تہذیب و ثقافت میں جو بڑی تبدیلیاں آئیں اُن میں سے ایک یہاں ہوٹلوں کا قیام تھا۔ یہ ہوٹل انگریزوں کے ساتھ ساتھ یہاں کے امراء اور طبقہ اشرافیہ میں بھی بے حد مقبول تھے۔ ان کے علاوہ یہاں لاہور کا پڑھا لکھا طبقہ بھی زندگی کی الجھنوں کو کم کرنے اور سکون و راحت تلاش کرنے میں اپنا وقت گزارتا۔ عبداللہ ملک اپنے کالم میں اس کی تصویر کشی

کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”کل جب سورج ڈوب چکا، رات کی سیاہی چاروں طرف پھیل گئی اور صاف اور کشادہ مال روڈ بجلی کے قلموں کی روشنی میں چمکنے لگی اور ادھر میٹرو کی برقی بتیاں روشن ہوئیں۔ میٹرو کے پنکھوں کی ہوا باغ کے پھولوں اور اینگلو پاکستانی لڑکیوں کے معطر لمس میں بسی ہوئی من چلوں کی اداس طبعیتوں کو آسودگی اور فرحت بخشنے لگی کہ اتنے میں بجلی کی روشنی گل ہو گئی اور چاروں طرف اندھیرا چھا گیا..... مغربی موسیقی کی ڈھنیں تھم گئیں۔ نوجوانوں کے قہقہے خاموش ہو گئے..... ریسٹوران اور کیفے لاہور کے درمیانی طبقے کی زندگی کا ایک جزو بن گئے ہیں..... آج ان اداس، پریشان اور تلخیوں سے گھری ہوئی زندگیوں کے لیے آخری چائے پناہ۔ یہ کیفے اور ریسٹوران ہی ہیں لیکن ان کیفوں اور ریسٹورانوں میں ہم دنیا اور اُس کے دکھوں سے بھاگ کر آئے ہیں۔ چائے اور کافی کی پیالی کو جام سے سمجھ کر نوش کر جاتے ہیں تاکہ کچھ تو غم ہلکا ہو۔“ (۵)

درج بالا کالم کا اقتباس لاہوری تہذیب و ثقافت میں بدلتی اقدار کے ساتھ ہوٹلوں، ریسٹورانوں اور کیفوں کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ آج بھی لاہوری ثقافت اور تہذیبی زندگی میں ہوٹل، ریسٹوران اور کیفے بڑی اہمیت رکھتے ہیں جہاں سرشام یہاں کے لوگ جا کر اپنی حیثیت کے مطابق چائے، کافی یا کھانا کھا کر دوستوں کے ساتھ میل ملاقات کرتے ہیں۔ لاہور کی تہذیبی زندگی میں کچھ ہوٹل، ریسٹوران اور چائے خانے کچھ خاص سرگرمیوں کے باعث پہچانے جاتے تھے۔ وہاں بیٹھنے والوں کی کثیر تعداد کا لاہور کی ادبی، سیاسی اور سماجی زندگی میں بڑا حصہ تھا۔ مثلاً پاک ٹی ہاؤس، عرب ہوٹل، نگینہ بیکری، چائینز لنچ ہوم وغیرہ۔ واصف ناگی اپنے کالم میں جو وہ لاہور کہیں کھو گیا، کے عنوان سے شائع ہوا میں لاہور کے قدیم چائے خانوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”لاہور میں کئی قدیم چائے خانے تھے۔ دہلی مسلم ہوٹل انارکلی (اس کے سامنے کبھی نظام ہوٹل بھی تھا) پھر لاہور میں نگینہ بیکری بھی کبھی ادیبوں اور شاعروں کا گڑھ رہی ہے۔ عرب ہوٹل لاہور میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے نزدیک ۱۹۲۶ء میں کویت کے ایک عرب نے قائم کیا تھا۔ اس ہوٹل سے کئی ادبی تحریکوں نے جنم لیا تھا۔ ادب کی تاریخ میں اس عرب ہوٹل کا نام ہمیشہ یاد رہے گا..... نگینہ بیکری بھی ۱۹۳۵ء میں قائم ہوئی تھی۔ یہ چائے خانہ بھی کئی ادیبوں اور شاعروں کا گڑھ تھا۔ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ لاہور کے چائے خانوں میں بعض ادیب و شاعر اور دانش ور کئی کئی چائے خانوں میں ایک ہی دن میں جاتے تھے۔ ایک چائے خانے سے اٹھے تو دوسرے چائے خانے میں چلے گئے اور وہاں سے تیسرے..... پاک ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس نے ادب کی دنیا کو کئی نامور لوگ دیے۔“ (۶)

وقت کے ساتھ پرانے ریسٹوران، کیفے اور چائے خانوں کی جگہ نئے ہوٹل متعارف ہوئے جہاں مختلف ملکوں کی خوراک اور کھانے لاہور میں متعارف کرائے گئے۔ آج کل تمام پنج ستارہ ہوٹلوں میں مختلف ملکوں اور علاقوں کے علیحدہ

علحدہ حصے موجود ہیں جہاں اُن ملکوں اور علاقوں کے کھانے پورے لوازمات کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں اور لاہوریوں کی کثیر تعداد چائیز، تھائی اور جاپانی کھانے کے لیے ان ہوٹلوں کا رخ کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شہر کے ہر علاقے میں لاہوری خوراک وافر انداز سے موجود ہے جہاں صبح صبح لاہوری ناشتے پوری، پنپے، نہاری، نان، سری پائے خریدنے اور کھانے والوں کا ہجوم نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ لسی جولہ ہوریوں کا پسندیدہ اور مرغوب مشروب ہے اُس کی دکانوں پر بھی بڑی تعداد میں لوگ موجود ہوتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے اپنے بہت سے کالموں میں مختلف انداز میں لاہوری کھانوں کا ذکر کیا ہے۔ اپنے ایک کالم میں وہ لکھتے ہیں:

”اور یہ میرے جیسے شخص کے ساتھ ہوا جس نے اپنے بچوں کو سراسر دیسی خوراک پر پالا بلکہ لاہوری خوراک پر پالا یعنی رائل پارک کے سری پائے اور لسی ناشتے کے طور پر، پھر دوپہر کے کھانے کے لیے حاجی کی نہاری اور تندروی روٹیاں اور رات کو گوال منڈی کی مچھلی، ہریسہ اور اس کے بعد کھیر یعنی فالودے کے پیالوں کے بعد، اور اب وہی بچے اتنے نالائق ہو گئے ہیں کہ باقاعدہ اُن خوراکوں سے منحرف ہو گئے ہیں۔ کبھی لبنانی شوارما چارہ ہے ہیں اور کبھی کسی جہازی سائز کے سینڈویچ میں دانت گاڑے ہوئے ہیں۔ عجیب بد بلائیں خوراکیں کھاتے ہیں اور گھر کی ہانڈی کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ ہماری خوراک کا کلچر بالکل ہی بدل گیا ہے۔“ (۷)

بیرونی اثرات لاہوری تہذیب و ثقافت کے ساتھ ساتھ کھانوں پر بھی اثر انداز ہوئے اور ایسی بہت سی چیزیں اور کھانے جو کبھی یہاں شجر ممنوعہ تھے یہاں کے لوگوں کی زندگیوں میں رچ بس کر لاہوری تہذیب کا حصہ بننے چلے گئے لیکن لاہور کے مقامی کھانے اور ناشتے اپنی مثال آپ ہیں اور اُن کا کوئی نعم البدل نہیں۔ کچھ جگہیں اور نام خاص طور سے ان ناشتوں اور کھانوں کے لیے مشہور ہیں مثلاً لکشمی چوک، رائل پارک، پیچھے کے پائے، سردار کی مچھلی، نسبت روڈ کا حریسہ، پرانی انارکلی کا فالودہ وغیرہ۔ لاہوری کھانوں کے علاوہ لاہوری ثقافت کی پہچان یہاں منائی جانے والی بسنت کا تہوار بھی تھا جو نہایت جوش و خروش سے منایا جاتا تھا۔ لاہوری زندگی میں بسنت کے تہوار کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اُردو نثری ادب کے ساتھ ساتھ کالم نگاری میں بھی اس تہوار کا ذکر شدت سے موجود ہے۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے کالم میں لکھتے ہیں:

”آج سے پچاس ساٹھ برس پیشتر اگلے روز بسنت ہو تو بسنت کی اُس رات کم از کم لاہور میں تو کسی بچے کو نیند نہ آتی تھی۔ یوں بھی بسنت سے ایک دن پہلے تناواں ڈٹے ہوا کرتا تھا یعنی آپ نے جتنی بھی پتنگیں، گڈیاں اور گڈے خریدے ہیں یا آپ کے ابا جی نے لے کر دیے ہیں ان میں تناویں ڈالی جاتی تھیں جو ایک بہت کیتافن تھا..... بسنت کے موقع پر دور پار کے رشتے دار بھی ملنے کے لیے آتے اور رواج تھا کہ بیٹیاں اپنے ماں باپ کے گھر جاتی تھیں، خصوصی پکوان، قیے والے نان، پراٹھے اور حلیم وغیرہ ہوا کرتے تھے۔ میں بھی پیشتر بچوں کی مانند بسنت کی صبح کو بلکہ منہ اندھیرے کوٹھے پر جا پہنچتا تھا۔۔۔ بسنت کا آسمان اپنے اندر کتنا سحر انگیز رومان رکھتا تھا

بیان نہیں ہو سکتا۔“ (۸)

لاہور کا یہ رنگا رنگ تہوار جو ہر امیر غریب کا تہوار تھا اور بچوں سے لے کر بڑوں اور بوڑھوں تک میں بے حد مقبول تھا۔ کمرشل ہوا تو بہت سے داؤ بیچ اختیار کیے جانے لگے۔ دھاتی ڈور کے استعمال اور ہوائی فائرنگ نے کئی گھروں کو اُجاڑ دیا۔ معصوم بچوں کی گردنیں کٹ گئیں، راستہ چلتے معصوم لوگ اپنی جان سے ہاتھ دھونے لگے۔ لاہور شہر کی چھتوں پر لاکھوں روپوں کی ادائیگی کے عوض تجارتی اداروں اور ملٹی نیشنل کمپنیوں نے بسنت کے انتظامات کر کے بہتی لنگا میں ہاتھ دھوئے۔ ان فیشن ایبل کوٹھوں اور چھتوں پر اداکار، سیاست دان اور طبقہ امراء کی آمد ہوئی۔ پُر تکلف کھانے، موسیقی، مجرا اور پتنگ بازی ایک جشن کی صورت اختیار کر گئی۔ پتنگ بازی کی صنعت سے وابستہ افراد کا کاروبار چمک اٹھا اور لاہوری بسنت بین الاقوامی طور پر لاہور کے ثقافتی تہوار کی صورت پہچانی جانے لگی۔ دھاتی ڈور سے انسانی جانوں کے ضیاع سے اس باب اختیار کو مجبوراً اس تہوار پر پابندی لگانی پڑی اور چند لوگوں کی مجرمانہ سوچ نے اس شان دار تہوار کو گمنامی کی دلدل میں اُتار دیا اور لاہور کا آسمان ان رنگ برنگی گڈیوں اور پتنگوں سے خالی ہو گیا۔

قدیم اور پرانا لاہور اگرچہ سادگی کی مثال تھا لیکن اُس کی روایات، تہذیب اور ثقافت اپنے اندر ایک حسن اور خوب صورتی رکھتی تھی جو اس جدید لاہور کی بھاگتی دوڑتی اور ہنگاموں سے پُر زندگی میں ماند پڑ گئی ہیں۔ اگرچہ اس جدید لاہور کی اپنی آن بان اور شان ہے لیکن یہاں کے باسی پرانے لاہور کو، اس کی زندگی کو، اس کی روایات کو اور اس کی تہذیب اور ثقافت کو بہت یاد کرتے ہیں اور کالم نویسوں نے بھی اُس پرانے لاہور اور اُس کی زندگی پر بہت سے کالم لکھے ہیں۔ واصف ناگی اپنے کالم بعنوان ”وہ لاہور کہیں کھو گیا“ میں لکھتے ہیں کہ:

”قدیم شہر کسی بھی ملک کا ایک تاریخی ورثہ ہوتے ہیں۔ لاہور کا شمار دنیا کے ان تاریخی شہروں میں ہوتا ہے جس کا تاریخی ورثہ کبھی ایک خزانہ تھا۔ آج بھی تاریخی لحاظ سے یہ شہر دیکھنے کے لائق ہے۔ اگر کوئی اس کی تاریخی اور قدیم عمارات کو اس طرح سامنے لے کر آئے کہ اُن کا تاریخی حسن نکھر جائے تو یقین کریں کہ گورے اور سیاحت کے شوقین پاگل ہو جائیں۔ اسی لاہور میں اپر مال پر اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس ہے۔ انگریزوں کی تعمیر کردہ یہ عمارت نہایت پُرکشش ہے، اس میں کبھی غیر ملکی مہمان آکر ٹھہرا کرتے تھے۔ یہ عمارت آج بھی بڑی خوبصورت ہے۔ لاہور کی وہ نسل حیات ہے جس نے گولی والی بوتل، بھائی گیٹ کے باہر گلابی، لال اور سبز رنگ کے دودھ والی بوتل پی ہوگی۔ سوڈا واٹر اور دودھ سوڈا پیا ہوگا، جس نے پرانے بڑے کیمروں سے اپنی تصویر بنوائی ہوگی۔ ہم نے بھی اس کیمرے سے تصویر بنوائی تھی۔“ (۹)

لاہوری ثقافت کا ذکر میلوں کے ذکر کے بغیر اُدھورا ہے۔ کہاوت تھی کہ ہفتے کے سات دن ہیں جبکہ لاہور میں لگنے والے میلوں کی تعداد آٹھ ہے تو میں گھر کب جاؤں؟ مختلف موسموں میں لگنے والے میلے ہوں یا بزرگوں کے مزارات پر منعقد ہونے والے میلے..... بہر حال لاہوری ثقافت کی ایک نمایاں پہچان ہیں۔ ان میلوں میں داتا گنج بخشؒ کے عرس پر منعقد ہونے والا میلہ اور مادھو لال حسینؒ کے مزار پر لگنے والا میلہ جو پہلے شالامار باغ کے اندر لگتا تھا نمایاں حیثیت رکھتے

ہیں۔ ان میلوں میں پورے پنجاب سے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ گھوڑے شاہ کے مزار پر لگنے والا میلہ بھی لاہور کے لوگوں میں بے حد مقبول ہے۔ اس میلے کی حقیقت سے عبدالمجید شیخ اپنے کالم میں آگاہ کرتے ہیں:

”ہماری نوعمری میں میرے والد ہمیں سالانہ میلے پر، خواہ چند گھنٹوں کے لیے ہی سہی، بڑی رغبت سے لے جایا کرتے تھے، جو حضرت مادھولعل حسینؒ کے ساتھ ساتھ شالامار باغ میں لگتا تھا..... میلے سے لوٹتے وہ ہمارے لیے آوے کے پکے ہوئے مٹی کے چند گھوڑے لایا کرتے تھے اور ہر بار ان کا کہنا ہوتا تھا، ’تم مراد مانگو اور یہ گھوڑے اس کو پوری کریں گے، یہ آوے کے پکے ہوئے گھوڑے‘ لگھو گھوڑے‘ گھوڑے شاہ کے مزار سے لائے گئے تھے جو لاہور کا طفل برگزیدہ تھا۔ مقبول عوامی روایت کے مطابق اگر اس طفل برگزیدہ کے پسندیدہ مشغلے کے لیے کوئی شخص گھوڑا لے کر جائے، خواہ وہ اصلی ہو یا محض مٹی کا بنا ہوا تو اس کے مزار پر جو بھی مراد مانگی جائے وہ پوری ہو جاتی ہے۔ لاکھوں نہ سہی، ہزار ہا لوگ ہیں جن کا یقین ہے کہ طفل برگزیدہ وہ مراد پوری کرتا ہے کیوں کہ وہ پاکیزہ دل ہے۔“ (۱۰)

لاہور کے باسیوں کے عقیدے کو بیان کرتا درج بالا اقتباس اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ لاہور شہر کے رہنے والے لوگ خوش عقیدہ ہیں جو مزارات پر منتیں مان کر اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشات کے حصول کی آس بھی لگا لیتے ہیں۔ لاہور کی ثقافت اور تہذیب کی پہچان جہاں اور بہت سی چیزیں ہیں وہیں لاہوریوں کو دیا گیا لقب ’رنگ باز‘ بھی سننے اور پڑھنے کو ملتا ہے۔ اس لقب کا تعلق یہاں رہنے والوں کے اُس پیسے سے جو اب ہے جو مغل بادشاہ اکبر اور شاہ جہاں کے زمانے میں ایک بڑا کاروبار تھا۔ اس دور حکومت میں لاہور نیل کی دنیا کا ایک بڑا مرکز تھا اور شہنشاہ اکبر کے ہی زمانے میں لاہور کے قلعے سے ذرافا صلیہ پر ہندوستان میں نیل کی پہلی باقاعدہ اور بڑی منڈی قائم کی گئی۔ یہ لاہور ہی کا نیل تھا جو ’جینز‘ کے نیلے رنگ کا باعث بنا۔ اس سلسلے میں ذوق احمد اپنے کالم ’لاہور رنگ‘ میں لکھتے ہیں:

”اس دور میں لاہور کے مضافات میں میلوں تک نیل کے پودے تھے جہاں لوگ ان پودوں کا ست نکالتے تھے جس کے بعد ست کو بڑی بڑی کڑاہیوں میں ڈال کر پکایا جاتا تھا۔ ست پکنے کے بعد اس کا پاؤڈر اور ڈلیاں بنائی جاتی تھیں جس کے بعد یہ ڈلیاں ٹوکریوں اور بور یوں میں بند ہو کر منڈی پہنچتی تھیں..... اس کے بعد گڈوں کے ذریعے یہ ڈلیاں بمبئی اور کولکٹہ پہنچتی تھیں۔ وہاں سے انھیں فرانسس اور اطالوی تاجر خرید کر جہازوں میں بھرتے تھے۔ یہ نیل بعد ازاں اٹلی کے ساحلی شہر جنیوا پہنچ جاتا تھا جو فرانسس شہر نیم (Nimes) کے قریب تھا جہاں ہزاروں کھڈیاں تھیں جن پر موٹی سوئی کپڑا بنا جاتا تھا..... وہ لوگ اس کپڑے پر لاہور کا نیل چڑھاتے..... درزی اس سے مزدوروں، مستریوں اور فیکٹری ورکرز کے لیے پتلونیں سیتے تھے۔ وہ پتلونیں بعد ازاں..... جینز کہلانے لگیں..... مغلوں کے دور میں اگر لاہور کا نیل نہ ہوتا تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شاید جینز نہ بنتی اور اگر بنتی بھی تو کم از کم یہ نیلی نہ ہوتی۔“ (۱۱)

بدلتے زمانے کے ساتھ نیل کی صنعت تو زوال پذیر ہو گئی لیکن بمبئی اور کولکتہ کے تاجروں کا دیا ہوا لاہوریوں کو 'رنگ باز' کا خطاب باقی رہا جو فارسی زبان کے باعث کسی پیشے سے وابستہ افراد کو دیا جاتا ہے جیسے کبوتر باز، اور چونکہ لاہور کی آبادی کی اکثریت نیل کے پیشے سے وابستہ تھی اس لیے پورا لاہور رنگ باز ہو گیا اور یہ رنگ بازی آج بھی لاہوری مزاج اور معاشرت میں موجود ہے۔

لاہور کے کالم نگاروں نے لاہوری تہذیب و ثقافت کے سبھی پہلوؤں کو اپنے کالموں میں بیان کیا ہے۔ لاہور جو پورے پنجاب کی ثقافت کا گڑھ ہے جہاں کا کھانا پینا، پہننا اوڑھنا، میلے ٹھیلے، تہوار، گیت، شادی بیاہ، عمارات سب کچھ منفرد ہے اور اس کی یہی انفرادیت اور اس سے جڑی کہانیاں اردو کالم نگاری میں بیان ہوتی ہیں اور اُس وقت تک اردو کالم نگاری کا موضوع رہیں گی جب تک لاہور شہر کی رونقیں اور تہذیب و ثقافت لوگوں کو اپنا اسیر رکھیں گی۔

حوالہ جات

- ۱۔ اشرف ندیم، جدید اردو لغت، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء)، ص ۵۵۵
- ۲۔ انور سدید، سخن ہائے گسترانہ، (کراچی: فضلی سنز (پرائیویٹ)، ۲۰۰۷ء)، (مرتبہ)، ص ۱۲
- ۳۔ پیران نوال، لاہور جب جوان تھا، (لاہور: نگارشات پبلشرز، ۲۰۱۶ء)، مترجم: نعیم الحسن، ص ۱۱
- ۴۔ عبداللہ ملک، یہ لاہور ہے، (لاہور: دارالشعور، ۲۰۱۰ء)، مرتب: ایم آر شاہد، ص ۳۴
- ۵۔ ایضاً، ص ۳۱
- ۶۔ واصف ناگی، وہ لاہور کھیں کھو گیا، مشمولہ: روزنامہ جنگ، (لاہور: ۲۹ نومبر ۲۰۲۰ء)
- ۷۔ مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء)، ص ۲۴۰
- ۸۔ مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ ۲، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۲۱ء)، ص ۷۵
- ۹۔ واصف ناگی، وہ لاہور کھیں کھو گیا، مشمولہ: روزنامہ جنگ، (لاہور: یکم نومبر ۲۰۲۰ء)
- ۱۰۔ عبد المجید شیخ، قصے لاہور کے، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء)، مترجم: وحید رضا بھٹی، ص ۱۴
- ۱۱۔ ذوق احمد، لاہور کا رنگ، مشمولہ: روزنامہ دنیا، (لاہور: ۲۴/۱۸ اپریل ۲۰۱۸ء)

